أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

Ayat No 1

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ الۡمَلِكِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۱﴾

Yusabbihu lilaahi maa fis samaawaati wa maa fil ardil Malikil Quddoosil 'Azeezil Hakeem

(62 *AlJuma Verse* 01 الجمعة ایت 01)

ترجمہ تفہیم القرآن

اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے۔ بادشاہ ہے نہایت مقدس، زبردست اور حکیم۔ (1)

All that is in the heavens and all that is in the earth extols the glory of Allah, the Sovereign, the Holy, the All- Mighty, the All-Wise.

تفسیر تفہیم القرآن

سورۃ الجُمُعَة 1

تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۃ حدید، حواشی 1، 2، الحشر، حواشی 36، 37، 41۔ آگے کے مضمون سے یہ تمہید بڑی گہری مناسبت رکھتی ہے۔ عرب کے یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات وصفات اور کارناموں میں رسالت کی صریح نشانیاں بہ چشم سر دیکھ لینے کے باوجود، اور اس کے باوجود کہ توراۃ میں حضرت موسیٰؑ نے آپ کے آنے کی صریح بشارت دی تھی جو آپ کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہوتی

تھی، صرف اس بناپر آپ کاانکار کر رہے تھے کہ اپنی قوم اور نسل سے باہر کے کسی شخص کی رسالت مان لینا انہیں سخت ناگوار تھا۔ وہ صاف کہتے تھے کہ جو کچھ ہمارے ہاں آیا ہے ہم صرف اسی کو مانیں گے۔ دوسرے کسی تعلیم کو، جو کسی غیر اسرائیلی نبی کے ذریعہ سے آئے، خواہ وہ خداہی کی طرف سے ہو، تسلیم کرنے کے لیے وہ قطعی تیار نہ تھے۔ آگے کی آیتوں میں اسی رویہ پر انہیں ملامت کی جارہی ہے، اس لیے کلام کاآغاز اس تمہیدی فقرے سے کیا گیا ہے۔ اس میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ یعنی یہ پوری کائنات اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ ان تمام نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جن کی بناپر یہودیوں نے اپنی نسلی برتری کا تصور قائم کرر کھا ہے۔ وہ کسی کا رشتہ دار نہیں ہے۔ جانب داری (Favouristism) کا اس کے ہاں کوئی کام نہیں۔ اپنی ساری مخلوق کے ساتھ اس کا معاملہ یکساں عدل اور رحمت اور ربوبیت کا ہے۔ کوئی خاص نسل اور قوم اس کی چہیتی نہیں ہے کہ وہ خواہ کچھ کرے، بہر حال اس کی نوازشیں اسی کے لیے مخصوص رہیں، اور کسی دوسری نسل یا قوم سے اس کو عداوت نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر خوبیاں بھی رکھتی ہو تو وہ اس کی عنایات سے محروم رہے۔ پھر فرمایا گیا کہ وہ بادشاہ ہے، یعنی دنیا کی کوئی طاقت اس کے اختیارات کو محدود کرنے والی نہیں ہے۔ تم بندے اور رعیت ہو۔ تمہارا یہ منصب کب سے ہو گیا کہ تم یہ طے کرو کہ وہ تمہاری ہدایت کے لیے اپنا پیغمبر کسے بنائے اور کسے نہ بنائے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وہ قدوس ہے۔ یعنی اس سے بدرجہامنزہ اور پاک ہے کہ اس کے فیصلے میں کسی خطااور غلطی کاامکان ہو۔ غلطی تمہاری سمجھ بوجھ میں ہو سکتی ہے۔ اس کے فیصلے میں نہیں ہو سکتی۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی دو مزید صفتیں بیان فرمائی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ زبردست ہے، یعنی اس سے لڑ کر کوئی جیت نہیں سکتا۔ دوسری یہ کہ وہ حکیم ہے، یعنی جو کچھ کرتا ہے وہ عین مقتضائے دانش ہوتا ہے، اور اس کی تدبیریں ایسی محکم ہوتی ہیں کہ دنیا میں کوئی ان کا توڑ نہیں کر سکتا۔

تفسیر فی ظلال القرآن

اس آغاز میں بتایا جاتا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ لیکن یہ کائنات جو تسبیح کر رہی ہے اس میں سے جن چیزوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ اس سورت کے موضوع اور محور کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اور اس کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہیں۔ سورت کا نام جمعہ ہے۔ اس میں یہ تعلیم ہے کہ جمعہ کی اہمیت کیا ہے، اس دن تمام امور سے فارغ ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور جمعہ کی نماز کے وقت لہو و لعب اور محنت و تجارت چھوڑ کر، اللہ کے ذکر کی طرف آنا چاہئے۔ لوگ جمعہ کو چھوڑ کر اور خطبہ جمعہ چھوڑ کر جس مال تجارت کی طرف بھاگے ہیں، اس کا **مالک** تو اللہ ہے، جو بادشاہ مطلق ہے۔ دنیا کا یہ مال اس کے اختیار میں ہے اور وہ ''**القدوس**'' ہے۔ وہ مقدس ہے اور پاک ہے اور پوری کائنات اس کی پاکی اور تقدیس بیان کر رہی ہے۔ جبکہ یہ لوگ اس کی تقدیس چھوڑ کر لہو و لعب اور تجارت کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ وہ ''**العزیز**'' ہے، یہودیوں کو جو دعوت مباہلہ دے رہا ہے، وہی غالب ہے، وہ سب لوگوں کو اٹھا کر ان سے حساب و کتاب کا انتظام کرتا ہے۔ اور وہ ''**الحکیم**'' ہے۔ جس نے عربوں جیسی ناخواندہ قوم سے ایک رسول اٹھایا جو آیات پڑھ کر سناتا ہے، علم و دانش سکھاتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم خطبہ جمعہ کا مقصود ہے۔ غرض جو صفات یہاں آغاز میں لائی گئی ہیں، سورت کا مضمون بھی انہی کی سمت پر ہے۔

تفسیر تدبر القرآن

ا۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت (يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ)(1)۔

(تمہید)۔ یہ تمہیدی آیت معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے۔ سابق سورۃ میں صیغہ ماضی یسبح آیا ہے جو تصویر حال کا فائدہ دے رہا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی چار صفات بیان ہوئی ہیں۔ الملک جس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ القدوس جس کے معنی ہر نقص و عیب سے پاک کے ہیں۔ العزیز جس کے معنی جیسا کہ بار بار واضح کیا جا چکا ہے غالب و مقتدر کے ہیں۔ الحکیم وہ ذات جس کے ہر قول و فعل میں حکمت ہے۔ یہ چاروں صفات آگے والی آیت کی تمہید کے طور پر یہاں آئی ہیں۔ ان کی وضاحت آیت کی تفسیر کے تحت ہی مناسب رہے گی۔

Ayat No 2

هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍۙ ۲

Huwal lazee ba'asa fil ummiyyeena Rasoolam min hum yatloo 'alaihim aayaatihee wa yuzakkeehim wa yu'allimuhumul Kitaaba wal Hikmata wa in kaanoo min qablu lafee dalaalim mubeen

(62 *AlJuma Verse* 02 الجمعة ایت 02)

ترجمہ تفہیم القرآن

وہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسول خود اُنہی میں سے اُٹھایا، جو اُنہیں اُس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اِس سے پہلے وہ کھُلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔(2)

He it is Who has sent to the gentiles a Messenger from among themselves, one who rehearses to them His verses, purifies their lives, and imparts to them the Book and the Wisdom although before that they were in utter error;

سورۃ الْجُمُعَة 2

یہاں امی کا لفظ یہودی اصطلاح کے طور پر آیا ہے، اور اس میں ایک لطیف طنز پوشیدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کو یہودی حقارت کے ساتھ امی کہتے اور اپنے مقابلہ میں ذلیل سمجھتے ہیں، انہیں میں اللہ غالب و دانا نے ایک رسول اٹھایا ہے۔ وہ خود نہیں اٹھ کھڑا ہوا ہے بلکہ اس کا اٹھانے والا وہ ہے جو کائنات کا بادشاہ ہے، زبردست اور حکیم ہے، جس کی قوت سے لڑ کر یہ لوگ اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے، اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید میں "اُمی" کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور سب جگہ اس کے معنی ایک ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف مواقع پر وہ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں وہ اہل کتاب کے مقابلہ میں ان لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے جس کی پیروی وہ کرتے ہوں۔ مثلاً فرمایا قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَا لۡاُمِّيّٖنَ ءَ اَسۡلَمۡتُمۡ (آل عمران۔ 20)۔ "اہل کتاب اور امیوں سے پوچھو کیا تم نے اسلام قبول کیا؟" یہاں امیوں سے مراد مشرکین عرب ہیں، اور ان کو اہل کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ سے الگ ایک گروہ قرار دیا گیا ہے۔ کسی جگہ یہ لفظ خود اہل کتاب کے اَن پڑھ اور کتاب اللہ سے ناواقف لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسے فرمایا وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ (البقرہ۔ 78)۔ "ان یہودیوں میں کچھ لوگ امی ہیں، کتاب کا کوئی علم نہیں رکھتے، بس اپنی آرزوؤں ہی کو جانتے ہیں"۔ اور کسی جگہ یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جس سے مراد دنیا کے تمام غیر یہودی ہیں۔ مثلاً فرمایا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ (آل عمران۔ 75)۔ یعنی "ان کے اندر یہ بد دیانتی پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں امیوں کا مال مار کھانے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے"۔ یہی تیسرے معنی ہیں جو آیت زیر بحث میں مراد لیے گئے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی زبان کے لفظ گویم کا ہم معنی ہے، جس کا ترجمہ انگریزی بائیبل میں Gentiles کیا گیا ہے، اور اس سے مراد تمام غیر یہودی یا غیر اسرائیلی لوگ ہیں۔

لیکن اس یہودی اصطلاح کی اصل معنویت محض اس کی اس تشریح سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دراصل عبرانی زبان کا لفظ گویم ابتداءً محض اقوام کے معنی میں بولا جاتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہودیوں نے اسے پہلے تو اپنے سوا دوسری قوموں کے لیے مخصوص

کر دیا، پھر اس کے اندر یہ معنی پیدا کر دیے کہ یہودیوں کے سوا باقی تمام اقوام ناشائستہ، بد مذہب، ناپاک اور ذلیل ہیں، حتیٰ کہ حقارت اور نفرت میں یہ لفظ یونانیوں کی اصطلاح Barbarian سے بھی بازی لے گیا جسے وہ تمام غیر یونانیوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ربیوں کے لٹریچر میں گوییم اس قدر قابل نفرت لوگ ہیں کہ ان کو انسانی بھائی نہیں سمجھا جا سکتا، ان کے ساتھ سفر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ان میں سے کوئی شخص ڈوب رہا ہو تو اسے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ آنے والا مسیح تمام گوییم کو ہلاک کر دے گا اور جلا کر خاکستر کر ڈالے گا (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، آل عمران، حاشیہ 64)۔

سورۃ الْجُمُعَة 3

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی یہ صفات چار مقامات پر بیان کی گئی ہیں، اور ہر جگہ ان کے بیان کی غرض مختلف ہے۔ البقرہ آیت 129 میں ان کا ذکر اہل عرب کو یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ آنحضور کی بعثت، جسے وہ اپنے لیے زحمت و مصیبت سمجھ رہے تھے، در حقیقت ایک بڑی نعمت ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) اپنی اولاد کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ البقرہ آیت 151 میں انہیں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان حضور ﷺ کی قدر پہچانیں اور اس نعمت سے پورا پورا فیض حاصل کریں جو حضور ﷺ کی بعثت کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہے۔ آل عمران آیت 164 میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو یہ احساس دلانے کے لیے ان کا اعادہ کیا گیا ہے کہ وہ کتنا بڑا احسان ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان اپنا رسول بھیج کر کیا ہے اور یہ لوگ کتنے نادان ہیں کہ اس کی قدر نہیں کرتے۔ اب چوتھی مرتبہ انہیں اس سورۃ میں دہرایا گیا ہے جس سے مقصود یہودیوں کو یہ بتانا ہے کہ محمد ﷺ تمہاری آنکھوں کے سامنے جو کام کر رہے ہیں وہ صریحاً ایک رسول کا کام ہے۔ وہ اللہ کی آیات سنا رہے ہیں جن کی زبان، مضامین، انداز بیان، ہر چیز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ فی الواقع وہ اللہ ہی کی آیات ہیں۔ وہ لوگوں کی زندگیاں سنوار رہے ہیں، ان کے اخلاق اور عادات اور معاملات کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کر رہے ہیں، اور ان کو اعلیٰ درجے کے اخلاقی فضائل سے آراستہ کر رہے ہیں۔ یہ وہی کام ہے جو اس سے پہلے تمام انبیاء کرتے رہے ہیں۔ پھر وہ صرف آیات ہی سنانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر وقت اپنے قول اور

عمل سے اور اپنی زندگی کے نمونے سے لوگوں کو کتاب الٰہی کا منشا سمجھا رہے ہیں اور ان کو اس حکمت و دانائی کی تعلیم دے رہے ہیں جو انبیاء کے سوا آج تک کسی نے نہیں دی ہے۔ یہی سیرت اور کردار اور کام ہی تو انبیاء کا وہ نمایاں وصف ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ پھر یہ کیسی ہٹ دھرمی ہے کہ جس کا رسول برحق ہونا اس کے کارناموں سے علانیہ ثابت ہو رہا ہے اس کو ماننے سے تم نے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اللہ نے اسے تمہاری قوم کے بجائے اس قوم میں سے اٹھایا جسے تم امی کہتے ہو۔"

سورۃ الْجُمُعَة 4

یہ حضور ﷺ کی رسالت کا ایک اور ثبوت ہے جو یہودیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے عرب کی سرزمین میں آباد تھے اور اہل عرب کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، اور تمدنی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ان کی اس سابق حالت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ چند سال کے اندر محمد ﷺ کی قیادت و رہنمائی میں اس قوم کی جیسی کایا پلٹ گئی ہے اس کے تم عینی شاہد ہو۔ تمہارے سامنے وہ حالت بھی ہے جس میں یہ لوگ اسلام قبول کرنے سے پہلے مبتلا تھے۔ وہ حالت بھی ہے جو اسلام لانے کے بعد ان کی ہو گئی، اور اسی قوم کے ان لوگوں کی حالت بھی تم دیکھ رہے ہو جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا ہے۔ کیا یہ کھلا کھلا فرق، جسے ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کے سوا کسی کا کارنامہ نہیں ہو سکتا؟ بلکہ اس کے سامنے تو پچھلے انبیاء تک کے کارنامے ماند پڑ گئے ہیں۔

تفسیر فی ظلال القرآن

کہا گیا ہے کہ عربوں کو امی اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ بالعموم لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ نبی ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مہینہ تو یوں ہے، یوں ہے اور یوں ہے اور دس انگلیوں کے ساتھ تین بار اشارہ کیا اور فرمایا ہم ایک امی امت ہیں، ہم حساب اور کتاب نہیں کرتے"۔ (جصاص) یہ بھی کہا گیا ہے جو لکھا پڑھا نہیں ہے اسے امی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس حال میں ہے جس طرح ماں سے پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ لکھنا پڑھنا تو بعد میں سیکھنے سے ہوتا ہے۔

اور ممکن ہے امی اس لئے کہا گیا ہو کہ یہودی دوسری اقوام کو ''گویم'' کہتے تھے۔ عبرانی زبان میں گویم اقوام کو کہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم تو اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں اور دوسرے لوگ عام اقوام یعنی امم ہیں۔ یوں وہ عربوں کو امی کہتے تھے۔ امی کا یہ مفہوم کہ وہ امہ کی طرف منسوب ہے زیادہ موزوں نظر آتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ام کی طرف منسوب ہیں۔

یہودیوں کا یہ پختہ خیال تھا کہ نبی آخر الزمان ﷺ ان سے مبوث ہو گا اور ان کے اندر، جو اختلافات ہیں، ان کو وہ ختم کر دے گا۔ اور دنیا میں جو دوسری اقوام کے مقابلے میں شکست کھا گئے ہیں ان کو فتح نصیب ہو گی اور ذلت کے مقابلے میں ان کی عزت حاصل ہو گی اور وہ اس نبی کی برکت سے عربوں پر فتح کی دعا کیا کرتے تھے۔

حکمت ربانی کا تقاضا یہ ہوا کہ نبی آخر الزمان ﷺ عربوں سے پیدا ہو۔ یعنی امیین غیر الیسود میں پوری انسانی قیادت کے لئے درکار تھی، جیسا کہ اس سورت کے دوسرے پیر گراف میں آرہا ہے۔ اور جس طرح سورۃ صف میں گزرا کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے فکر و نظر کی کوتاہی اور ٹیڑھ پن کو اپنا لیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی طویل تاریخ میں اللہ کی امانت کے حوالے سے جو کچھ کیا اس کے پیش نظر اب وہ اس قابل نہیں ہے کہ آخری امانت ان کے سپرد کی جائے۔

اس علاقے میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی ایک مرکز دعوت بنایا تھا اور دعوت کا آغاز بیت اللہ کے سایہ میں حضرت خلیل اللہ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) نے فرمایا تھا۔

واذ یرفع........................العزیزالحکیم (921)(2:721۔921) ''اور یاد کرو، ابراہیم اور اسماعیل کو جب اس گھر کی دیوار میں اٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے۔ اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے۔ تو سب کچھ سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے در گزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو! جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوار دے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے''۔

غیب کے پردوں کے پیچھے یہ دعا موجود تھی، صدیاں پیچھے، اللہ کے ہاں محفوظ تھی، یہ درخواست ضائع نہیں ہوئی تھی اور یہ اس لئے رکھی گئی تھی کہ اللہ نے اس کے لئے اپنی حکمت کے مطابق جو وقت مقرر کیا تھا، وہ ابھی نہ آیا تھا۔ جب اس کی حکمت کے

مطابق مقرر کردہ وقت آگیا تو اللہ نے دعا منظور فرمائی اور رسول بھی آیا اور دعا کی منظوری بھی ہو گئی کیونکہ اللہ کے نظام قضا و قدر میں ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے، نہ آگے ہوتا ہے اور نہ پیچھے ہوتا ہے۔

غرض یہ درخواست اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق حقیقت بن گئی۔ یہ درخواست انہی الفاظ میں یہاں منظور کی جاتی ہے جن میں حضرت ابراہیم نے کی تھی۔ حضرت ابراہیم کے الفاظ تھے:

رسولاً منھم.................والحکمۃ (2:26) یہاں تک کہ حضرت ابراہیم نے اللہ کی حمد اور صفت میں یہ فرمایا تھا۔

انك انت................الحکیم یہی الفاظ یہاں بھی دہرائے گئے۔

وھوالعزیز الحکیم (26 : 3) رسول اللہ ﷺ سے خود ان کے بارے میں جب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بشارت ہوں۔ اور جب میری ماں کو حمل ٹھہرا تو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے، جس کی وجہ سے شام کے علاقہ بصری کے محلات روشن ہو گئے''۔ (روایت ابن اسحاق جس کی سند کو ابن کثیر نے جید کہا ہے)

ھوالذی...................ضلل مبین (2:26)'''' وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھای، جو انہی اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنورتا ہے، انکو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے''۔ اور یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے امیوں میں خود انہی میں سے ایک رسول اٹھایا اور اسے کتاب دے کر انہیں بھی اہل کتاب بنا دیا۔ ان میں سے ایک رسول بنایا اور اس کی وجہ سے ان کا مقام و مرتبہ بھی بلند ہو گیا۔ انہیں امیت اور امیت سے نکالا۔ یعنی ان پڑھ ہونے کے بجائے تعلیم یافتہ بنا دیا اور عوامی قوم (گویم) ہونے کے بجائے ممتاز قوم بنا دیا۔ ان کے حالات بدل دیئے اور وہ پوری دنیا کے ممتاز لوگ بن گئے۔

ویزکیھم (2:26)''ان کی زندگیوں کو پاک کرتا ہے''۔ اسلام جو کچھ انہیں سکھاتا تھا وہ تزکیہ اور تطہیر ہی تھی۔ ضمیر و شعور کی تطہیر، عمل اور طرز عمل کی تطہیر، خاندانی زندگی کی تطہیر، اجتماعی زندگی کی تطہیر، اور نظریات کی ایسی تطہیر کہ تمام شرکیہ عقائد نکال کر صرف ایک عقیدہ توحید دے دیا۔ تمام باطل تصورات ختم کر کے صرف صحیح اور برحق عقیدہ توحید عطا کر دیا۔ افسانوی افکار و عقائد کے بجائے واضح اور یقینی عقائد دے دیئے۔ اسی طرح اخلاقی طوائف الملوکی سے نجات دے کر ایمانی اخلاق کی سطح پر

ان کو پہنچادیا۔ معیشت سے ناپاک سودی نظام کی جگہ عادلانہ رزق حلال کا طریقہ بتایا۔ غرض ایک ہمہ گیر تطہیر کا انتظام کیا۔ اور ایک فرد، ایک جماعت اور ظاہر و باطن سب کی تطہیر کر دی۔ انسان کو اس زمینی زندگی اور زمینی تصورات سے بلند کر کے ایک ایسے نورانی مقام تک بلند کر دیا جو ربانی مقام ہے۔ اس مقام پر انسان کا معاملہ اللہ سے ہو گیا۔ یوں انسان اپنے آپ کو زمین کی ایک عاجز مخلوق سمجھنے کے بجائے ایک علوی مخلوق بن گیا۔

ویعلمھم............والحکمۃ (2:26)" اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔ یہ رسول ان کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے جس کی وجہ سے یہ امی بھی اہل کتاب ہو گئے۔ انہیں حکمت سکھاتا ہے اور اس پوری دنیا کے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام اشیا کی قیمت متعین کرنے میں صحیح اندازہ کرتے ہیں، ان کی روح صحیح فیصلے کرتی ہے۔ وہ صحیح عمل اختیار کرتے ہیں اور اس سے بڑی دانائی اور نہیں ہے۔

وان کانوا..................مبین (2:26)" حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے"۔ ایسی جاہلیت جس کی تعریف حضرت جعفر ابن ابوطالب نے حبشہ کے نجاشی کو بتایا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب قریش مکہ نے نجاشی کے پاس ایک سفارت بھیجی، جو عمر ابن العاص اور عبداللہ ابن ابوربیعہ پر مشتمل تھی۔ تاکہ وہ اس کے سامنے مہاجرین مسلمانوں کی بھیانک تصویر کھینچی اور اس کے ہاں اس کے موقف کو غلط رنگ میں پیش کریں تاکہ وہ ان کو اپنی مہمانی اور اپنے ہاں امانت سے نکال دے، تو اس موقعہ پر حضرت جعفر نے فرمایا:

" بادشاہ وقت! ہم ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحاشی کرتے تھے، صلہ رحمی نہ کرتے تھے، پڑوسیوں کا کوئی خیال نہ رکھتے تھے، ہم میں سے زور آور کمزور کو کھا جاتا تھا، ایسے حالات میں تھے کہ اللہ نے ہم میں ایک رسول بھیج دیا۔ اس نے دعوت دی کہ ہم ایک ہی خدا کو پکاریں اور اس کی بندگی کریں، ہم اس کے نسب کو جانتے ہیں، اس کی صداقت سے واقف ہیں، اس کی امانت اور عفت کے معترف ہیں۔ اس نے دعوت دی کہ ہم صرف اللہ وحدہ کو پکاریں اور اس کے علاوہ ہم جو پتھروں، بتوں کی بندگی کرتے تھے، انہیں ترک کر دیں۔ وہ کہتا ہے تم سچ کہو، امانت ادا کرو، صلہ رحمی کرو، پڑوسی کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرو، اور حرام چیزوں اور خون ریزی سے بچو، اس نے ہمیں ہر قسم کے فواحش سے روک دیا ہے،

جھوٹ سے روک دیا ہے۔ تیم کا مال کھانے سے روک دیا ہے۔ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے روک دیا ہے۔ حکم دیا ہے اللہ کی بندگی کریں اور کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔ وہ ہمیں نماز، روزہ اور زکوۃ کا حکم دیتا ہے''۔

باوجود اس کے کہ وہ جاہلیت اور گمراہی میں کانوں تک ڈوبے ہوئے تھے اللہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس نظریہ کے اٹھانے کے قابل ہیں۔ اس کے امین ہوں گے اور ان کے اندر صلاحیتیں موجود ہیں اور جدید دعوت کے لئے ضروری صلاحیت وہ رکھتے ہیں۔ جبکہ یہودیوں کی فطرت میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اور مصر کی غلامی نے ان کو نا قابل اصلاح بنا دیا ہے۔ ان کی نفسیات میں الجھن کجی اور انحراف پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے اب ان کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ نہ وہ موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے میں درست ہوئے اور نہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد یہ لوگ درست ہوئے، یہاں تک کہ اللہ نے ان پر لعنت اور غضب لکھ دیا اور وہ اس دنیا میں اللہ کے دین کے حامل نہ رہے اور قیامت تک ان سے یہ اعزاز چھن گیا۔ پھر اللہ کو اس بات کا بھی علم تھا کہ اس زمانے میں جزیرۃ العرب ہی دعوت اسلامی کے لئے بہترین مرکز کا کام کر سکتا تھا۔ اور پوری انسانیت کو جاہلیت کی گمراہی سے نجات دے سکتا تھا۔ کیونکہ دونوں بڑی شہنشاہوں نے تہذیب و تمدن کو بگاڑ دیا تھا۔ ان کی حکومت کو گھن لگ گیا تھا اور اندر سے ان کو کھوکھلا کر دیا تھا اور حالت یہ تھی جس پر ڈیٹسن پر تبصرہ کرتا ہے۔

"پانچویں اور چھٹی صدی میں دین دار دنیا ہلاکت اور بربادی کے قریب جا پہنچی تھی کیونکہ وہ عقائد و نظریات جو کسی تہذیب و تمدن کو جنم دیا کرتے ہیں وہ گر گئے تھے، اور ان گرے ہوئے نظریات کی جگہ لینے کے لئے کوئی دینی نظریہ موجود نہ تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ جس تہذیب و تمدن کی تعمیر میں، انسانیت کو چار ہزار سال تک محنت کرنی پڑی، وہ ٹوٹنے والا ہے اور اس کا شیرازہ بکھرنے ہی والا ہے۔ اور انسانیت ایک بار پھر جہالت کے دور میں واپس جانے والی ہے۔ کیونکہ پوری دنیا میں قبائل ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے نظر آتے تھے۔ پوری دنیا میں کوئی قانون اور کوئی نظام نہ تھا۔ انسانی تمدن ایک وسیع درخت کی طرح تھا جس کی وسیع شاخیں پوری دنیا پر سایہ فگن تھیں لیکن یہ درخت جھک گیا تھا اور گھن نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ ایسے ہی ہمہ گیر فساد کے اندر ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے تمام انسانیت کو پھر سے مجتمع کر دیا''۔ یہ شخص تھے حضرت محمد ﷺ، اور یہ صورت حال انسانیت کی، تو ایک یورپین مصنف کے نقطہ نظر سے تھی، لیکن اسلامی زاویہ نگاہ سے وقت اس سے تاریک تر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ جزیرۃ العرب سے اس بدوی امت کو اٹھایا۔ وہ قرآن و سنت لے کر اٹھی، اس کے اندر صلاحیت موجود تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنی اصلاح کی، اور پھر پوری دنیا کی تقدیر بدل دی۔ اللہ نے اس بدوی قوم کو رسول دیا۔ کتاب دی، رسول اور کتاب نے ان کو پاک کر دیا اور ان کو حکمت اور دانائی دی، اگرچہ پہلے وہ گمراہ تھے۔

تفسیر تدبر القرآن

(ھو الذی بعث فی الامین رسولا منھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم و یعلمھم الکتب الحکمۃ وان کانوا من قبل لف ضلل مبین)(2) فرمایا کہ اسی خدا نے جو اس کائنات کا حقیقی بادشاہ ہے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا کہ وہ ان کو اس آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو پاک کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ تدبر کیجئے تو معلوم ہو گا کہ تمہید کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جو صفات گنائی ہیں انہی کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے اس رسول کی بعثت ہوئی ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔

(رسول اللہ ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کی صفات کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہوئی)۔ وہی خلق کا بادشاہ حقیقی ہے۔ اس کی اس صفت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس نے اپنی نوعیت کو اپنے احکام و ہدایات سے آگاہ کرنے کے لیے اس کی طرف اپنا رسول بھیجا جس کی صفت یہ ہے کہ (یتلوا علیھم ایتہ) وہ لوگوں کو اس کی تعلیمات و ہدایات پڑھ کر سنا رہا ہے۔ وہ پاک اور قدوس ہے اس وجہ سے اس نے یہ چاہا کہ وہ اپنے رسول اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ سے لوگوں کو پاکیزہ بنائے چنانچہ اس کا رسول لوگوں کو عقائد و اعمال اور اخلاق کی خرابیوں سے پاک کر رہا ہے (یزکیھم)۔

پھر وہ عزیز اور حکیم ہے اس وجہ سے اس نے ایسا رسول بھیجا ہے جو اس کے بندوں کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے رہا ہے۔ یہاں لفظ کتاب شریعت اور قانون کے مفہوم میں ہے۔ شریعت اور قانون کا موثر نفاذ اسی کی طرف سے ہوتا ہے جو غالب و مقتدر ہو لیکن اللہ تعالیٰ صرف غالب و مقتدر ہی نہیں بلکہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے وہ اپنے رسول کے ذریعہ سے جس قانون کی تعلیم دے رہا ہے وہ مجرد اس کے زور اقتدار کا مظہر نہیں بلکہ اس کی حکمت اور بندوں کی دنیوی و اخروی مصلحت کا بھی مظہر ہے۔ یہ آیت بنی اسماعیل پر امتنان اور اظہار فضل و احسان کے محل میں ہے اس وجہ سے یہاں ان کے لیے لفظ امین بطور ایک

وصف امتیازی کے استعمال ہوا ہے۔اس لفظ سے اس کے محل میں بحث ہو چکی ہے لیکن اتنی بات کی یاد دہانی یہاں بھی ضروری ہے کہ یہ اصطلاح اگرچہ اہل کتاب بالخصوص یہود کی وضع کردہ تھی جس میں ان کے اندر مذہبی پندار کی جھلک بھی تھی اور اہل عرب کے لیے ان کا جذبہ تحقیر بھی نمایاں تھا۔ لیکن بنی اسماعیل چونکہ کتاب و شریعت سے ناآشنا تھے اس وجہ سے بغیر کسی احساس کہتری کے انہوں نے اس لقب کو اپنے لیے خود بھی اختیار کر لیا۔ پھر جب قرآن نے ان کے لیے اور ان کی طرف مبعوث ہونے والے رسول کے لیے اس لفظ کو بطور ایک وصف امتیازی کے ذکر فرمایا تو اس کا رتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ اہل عرب کے لیے اس نے گویا ایک تشریف آسمانی کی حیثیت حاصل کر لی جس سے قدرت کی یہ شان ظاہر ہوئی کہ جن کو ان پڑھ اور گنوار کہہ کر حقیر ٹھہرایا گیا وہ تمام عالم کی تعلیم و تہذیب پر مامور ہوئے اور جن کو اپنے حامل کتاب نہ شریعت ہونے پر ناز تھا وہ (کثیل الحماد یحمل اسفار) چار پائے بر و کتابے چند کے مصداق قرار پائے۔

یہاں یہ لفظ عربوں کے جذبہ شکر گزاری کو ابھارنے کے لیے استعمال ہوا ہے کہ انہیں اپنے رب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ان پر نظر کرم فرمائی۔ ان کی اصلاح و تربیت اور ان کو کتاب و حکمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرمایا اور جاہلیت کی اس تاریکی سے ان کو نکالا جس میں وہ اپنی امیت کے سبب سے اب تک گھرے ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو یہ نعمت مل گئی ہے وہ اس کو حرز جاں بنائیں اور کوشش کریں کہ دوسرے بھی اس کو قدر کریں ایسا نہ ہو کہ ناقدری کے سلب سے ہو اس سے محروم ہو کر رہ جائیں اور حاسدوں کا مقصد پورا ہو جائے۔ یہاں نبی امی ﷺ کی جو صفات مذکور ہوئی ہیں ان پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجئے تا کہ آپ کی بعثت کے مقاصد سے متعلق جو غلط فہمیاں منکرین حدیث نے پھیلائی ہیں وہ دور ہو جائیں۔ بنی اسماعیل کے اندر بعینہٖ انہی صفات کے پیغمبر اٹھائے جانے کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی۔ سورۃ بقرہ میں یہ دعا یوں مذکور ہے۔

(رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ‌ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ۔)(اے ہمارے رب! اور تو بھیجو ان کے اندر ایک رسول انہی میں سے جو تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے۔ بیشک تو غالب و حکیم ہے۔)

(آنحضرت ﷺ دعائے ابراہیم کے مظہر ہیں)۔اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح یہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہیں اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کے بھی مظہر ہیں جو آپ نے اولاد اسماعیل سے متعلق فرمائی تھی، گویا گوناگوں صفتیں آپ کے اندر جمع ہیں۔ یہ نوید مسیح ہیں اور دعائے ابراہیم ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہیں اور پھر یہ کہ وہ تمہارے ہی اندر کے ایک فرد ہیں۔ تمہارے اور ان کے درمیان اجنبیت و غیریت کا کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ تمہیں حقیر ٹھہرانے والے تمہیں یہ طعنہ نہیں دے سکتے کہ تمہیں ان کے یا کسی اور کے واسطہ سے روشنی ملی بلکہ اللہ نے تمام خلق پر تم کو سربلند کیا کہ تمہارے ذریعہ سے سارے جہان میں اجالا کرنے کا سامان کیا۔

(آنحضرت ﷺ کی بعثت تمام خلق کی طرف ہے)۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت اگرچہ امیوں کے اندر ہوئی لیکن آپ کی دعوت تمام خلق کے لیے ہے۔اس مسئلہ پر مفصل بحث اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ آنحضرت ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ایک بعثت خاص دوسری بعثت عام۔ آپ کی بعثت خاص بنی اسماعیل کی طرف ہوئی اور اس بعثت کے فرائض کی تکمیل حضور ﷺ نے بذات خود فرمائی۔ آپ کی بعثت عام، جو تمام خلق کی طرف ہوئی اس کے فرائض انجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو (شهداء الله في الارض) کے منصب پر سرفراز فرمایا جو اب قیامت تک کے لیے اس فرض کی انجام دہی پر مامور ہے (شهد الله في الارض) کے ہراول دستہ کی حیثیت چونکہ امیوں ہی کو حاصل ہوئی اس وجہ سے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ جو امی تھے اللہ تعالیٰ نے انہی کے واسطہ سے تمام خلق کو روشنی دکھائی۔

(وان كانو من قبل لفي ضلل مبين) یہ امیوں کے جذبہ شکر و سپاس کو ابھارنے کے لیے اس تاریکی طرف توجہ دلائی ہے جو ماضی میں ان پر چھائی رہی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ جاہلیت کی اس گھٹاٹوپ تاریکی کا خیال کریں جس میں وہ گرفتار رہ چکے ہیں تب انہیں اپنے رب کے فضل و احسان کا کچھ اندازہ ہوگا کہ اس نے ان کو کس چاہ ظلمت سے نکالا اور کس آسمان رفعت و عزت پر پہنچایا؟

Ayat No 3

وَّاٰخَرِيۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ‌ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝۳

Wa aakhareena minhum lammaa yalhaqoo bihim wa huwal 'azeezul hakeem

(62 *AlJuma Verse* 03 الجمعة ایت 03)

ترجمہ تفہیم القرآن

اور (اس رسول کی بعثت) اُن دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی اُن سے نہیں ملے ہیں۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ (3)

and (He has also) sent him to those others who have not yet joined them. He is the Most Mighty, the Most Wise.

تفسیر تفہیم القرآن

سورۃ الۡجُمُعَة 5

یعنی محمد ﷺ کی رسالت صرف عرب قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کی ان دوسری قوموں اور نسلوں کے لیے بھی ہے جو ابھی آ کر اہل ایمان میں شامل نہیں ہوئی ہیں مگر آگے قیامت تک آنے والی ہیں۔ اصل الفاظ ہیں وَّاٰخَرِيۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ۔ "دوسرے لوگ ان میں سے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں" اس میں لفظ منہم (ان میں سے) کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دوسرے لوگ امیوں میں سے، یعنی دنیا کی غیر اسرائیلی قوموں میں سے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ محمد ﷺ کو ماننے والے ہونگے جو ابھی اہل ایمان میں شامل نہیں ہوئے ہیں مگر بعد میں آ کر شامل ہو جائیں گے۔ اس طرح یہ آیت منجملہ ان آیات کے ہے جن میں تصریح کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام نوع انسانی کی طرف ہے اور ابد تک کے لیے ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات جہاں اس مضمون کی صراحت کی گئی ہے، حسب ذیل ہیں الانعام، آیت 19۔ الاعراف، 158۔ الانبیاء، 107۔ الفرقان، 1۔ سبا، 28 (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۃ سبا، حاشیہ 47)۔

یعنی یہ اسی کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ ایسی ناتراشیدہ امی قوم میں اس نے ایسا عظیم نبی بیدا کیا جس کی تعلیم وہدایت اس درجہ انقلاب انگیز ہے، اور پھر ایسے عالمگیر ابدی اصولوں کی حامل ہے جن پر تمام نوع انسانی مل کر ایک امت بن سکتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ان اصولوں سے رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔ کوئی بناوٹی انسان خواہ کتنی ہی کوشش کر لیتا، یہ مقام و مرتبہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ عرب جیسی پسماندہ قوم تو درکنار، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی قوم کا کوئی ذہین سے ذہین آدمی بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کی اس طرح مکمل طور پر کایا پلٹ دے، اور پھر ایسے جامع اصول دنیا کو دے دے جن پر ساری نوع انسانی ایک امت بن کر ایک دین اور ایک تہذیب کا عالمگیر وہمہ گیر نظام ابد تک چلانے کے قابل ہو جائے۔ یہ ایک معجزہ ہے جو اللہ کی قدرت سے رونما ہوا ہے، اور اللہ ہی نے اپنی حکمت کی بنا پر جس شخص، جس ملک، اور جس قوم کو چاہا ہے اس کے لیے انتخاب کیا ہے۔ اس پر اگر کسی بیوقوف کا دل دکھتا ہے تو دکھتا رہے۔

تفسیر فی ظلال القرآن

واخرین .... الحکیم (3:26) ''اور ان دوسرے لوگوں کے لئے بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں، اللہ زبردست اور حکیم ہے''۔ یہ آخرون کون ہیں ان کے بارے میں متعدد روایات آئی ہیں۔

امام بخاری نے روایت کی ہے، عبدالعزیز ابن عبداللہ سے، انہوں نے سلیمان ابن بلال سے، انہوں نے ثور سے، انہوں نے ابو الغیث سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے یہ فرماتے ہیں ''ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ پر سورۃ جمعہ نازل ہوئی۔

واخرین .... بھم (3:26) ''اور ان دوسرے لوگوں کے لئے بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں''۔ تو صحابہ کرامؓ نے پوچھا اللہ کے رسول وہ کون تو حضور نے ان کے سوال کا جواب نہ دیا، یہاں تک کہ تین بار آپ سے پوچھا گیا۔ ہم میں سلمان فارسی بھی موجود تھے۔ تو حضور نے اپنا دست مبارک سلمان فارسی پر رکھا اور پھر کہا، ''اگر ایمان ثریا کے اندر بھی ہو تو

ان لوگوں سے بعض لوگ یا ایک شخص اسے پالے گا''۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اہل ایران شامل ہیں۔اس لئے مجاہد کہتے ہیں اس سے مراد عجمی لوگوں میں وہ سب ہیں، جنہوں نے نبی ﷺ کی تصدیق کی۔

ابن ابو حاتم نے روایت کی ہے، اپنے والد سے، انہوں نے ابراہیم ابن علاء زبیری سے، انہوں نے ولید ابن مسلم سے، انہوں نے ابو محمد عیسیٰ ابن موسیٰ سے، انہوں نے ابو حازم سے، انہوں نے سہل ابن سعد ساعدی سے، وہ کہتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا میری امت کے بعض لوگوں کی پشتوں کی پشتوں میں اسے مرد اور عورتیں ہوں گی جو جنت میں بغیر حساب داخل ہوں گے اور اس کے بعد آپ نے پڑھا۔

واخرین ....بھم (3:26) یعنی محمد ﷺ کے بعد آئندہ آنے والے لوگ۔دونوں اقوال کی گنجائش ہے یعنی وہ لوگ جو عرب کے علاوہ ہیں اور وہ لوگ جو مسلمان ہو گئے تھے، حضور ﷺ کے دور میں اور ان کی اولاد جو بعد میں پیدا ہو گی۔ ان آیات اور روایات میں اشارہ ہے کہ یہ امت آئندہ زمانوں اور زمین کے تمام حصوں میں مسلسل رہنے والی امت ہے، اور اس نے اس ذمہ داری کو قیامت تک پورا کرنا ہے۔اس آخری دین کی حامل یہ امت آخر زمانے تک رہے گی۔

وھوالعزیزالحکیم (3:26) ''اور اللہ زبردست اور حکیم ہے''۔وہ قوی ہے، اور کسی امت کو مختار بنانے کی قدرت رکھتا ہے اور وہ حکیم ہے اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس منصب کے لئے چنے گئے۔اور متقدمین اور متاخرین میں سے لوگوں کو درجے دینا بھی اس کا فضل و کرم ہے۔

تفسیر تدبر القرآن

(واخرین منھم لما یلحقوا بھم وھو العزیز الحکیم)(3)۔

(ان امیوں کو جاندار و لطیف دعوت جو ابھی اسلام سے محروم تھے)۔اس کا عطف امین پر ہے۔یعنی جن امیوں کے اندر اس رسول کی بعثت ہوئی ہے انہی میں سے وہ دوسرے بھی ہیں جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے ہیں۔یہ اشارہ ان بنی اسماعیل کی طرف ہے جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔اس سے یہ بات نکلی کہ اوپر اگرچہ لفظ امین عام استعمال ہوا ہے لیکن اس

سے مراد صرف وہ بنی اسماعیل ہیں جو مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ چناچہ آیت کا آخری ٹکڑا (وان کانو من قبل لفی ضلل مبین) اسی پر دلیل بھی ہے۔ اب اس آیت میں نہایت خوب صورت اور بلیغ اسلوب سے بنی اسماعیل کے ان لوگوں کو بھی دعوت دے دی جو ابھی اسلام سے بیگانہ تھے۔ لفظ منھم سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ انہی امیوں میں سے جن کے لیے یہ آسمانی نعمت اتری ہے، کچھ دوسرے بھی ہیں لیکن ابھی وہ اس سے بدکے ہوئے ہیں۔ اور نہایت لطیف اسلوب سے ان کو دعوت دی گئی کہ جن کے لیے خوان نعمت بچھایا گیا ہے اور جو سب سے پہلے مدعو ہیں حیف ہے اگر وہ اس سے محروم رہیں۔ (لما یلحقوابم) (ابھی وہ ان سے ملے نہیں ہیں) کے الفاظ کے اندر یہ بشارت بھی مضمر ہے کہ گوابھی وہ ملے نہیں لیکن عنقریب مل جائیں گے گویا یہ مستقبل قریب میں ان کے قبول اسلام کی اسی طرح کی بشارت ہے جس طرح کی بشارت سورۃ ممتحنہ کی آیت 7 میں گزر چکی ہے۔

(ہدایت کے باب میں سنت الٰہی)۔ (وھو العزیز الحکیم) یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ایمان وہدایت کے باب میں اس نے اختیار فرمائی ہے۔ وہ چاہے تو ساری خلق کو ہدایت بخش دے، وہ عزیز و غالب ہے۔ لیکن وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے وہ ہدایت سے انہی کو سرفراز فرماتا ہے جو اس کی حکمت کے تحت سزاوار ہوتے ہیں۔ سورۃ دہر میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے (وما تشاء ون الا ان یشاء اللہ ان اللہ کان علیما حکیما یدخل من یشاء فی رحمتہ) (الدھر، 76، 30، 31) (اور تمہارا چاہنا کچھ نہیں مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بیشک اللہ ہی علم و حکمت والا ہے۔ وہی اپنی رحمت میں جس کو چاہے گا داخل کرے گا۔

Ayat No 4

ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۝٤

Zaalika fadlul laahi yu'teehi many-yashaaa; wallaahu zul fadlil 'azeem

(62 *AlJuma Verse* 04 الجمعة ایت 04)

ترجمہ تفہیم القرآن

یہ اس کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ (4)

Such is Allah's favour: He bestows it on whomsoever He pleases. Allah is the Lord of abounding favour.

تفسیر تفہیم القرآن

تفسیر فی ظلال القرآن

ذلك فضل..................... العظیم(4:26)" یہ اس کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے "۔

اللہ کی جانب سے کسی امت، کسی جماعت، کسی فرد کو اس کام کے لئے چن لینا کہ وہ اس عظیم امانت کا حامل ہو، اور اللہ کے نور اور فیض کا سرچشمہ ہو، اور ایسا مرکز ہو، جس پر زمین و آسمان ملتے ہوں، یہ اختیار و انتخاب اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہوتا ہے۔ اس سے بڑا فضل کہ اگر مومن اپنی جان اور مال اور اس دنیا کا سب کچھ بھی دے دے تو وہ اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس سے بڑا فضل کہ اگر مومن اپنی جان اور مال اور اس دنیا کا سب کچھ بھی دے دے تو وہ اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس راہ میں جدوجہد، مشکلات، جہاد غرض سب مشقتوں سے زیادہ قیمتی اور اہم۔

اللہ تعالٰی مدینہ کی اسلامی جماعت اور ان کے بعد آنے والے لوگوں، اور اسی راہ پر چلنے والوں کو یاد دلاتا ہے کہ یہ بہت بڑا فضل وکرم ہے تم پر، کہ اس نے تمہیں اس عظیم مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ تمہارے اندر رسول بھیجا ہے، جو تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور علم وحکمت کا یہ سرمایہ آنے والی نسلوں کے لئے جمع کرتا ہے، جو تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور علم وحکمت کا یہ سرمایہ آنے والی نسلوں کے لئے جمع کرتا ہے، اور پہلی جماعت اسلامی کے کارہائے نمایاں بطور نمونہ اور مثال قائم کرتا ہے۔ اللہ مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ یہ ہے عظیم فضل الٰہی جس کے مقابلے میں تمام دنیاوی واخروی انعامات ہیچ ہیں، جبکہ اس کے فرائض کی ادائیگی کے دوران ہر قسم کی مالی اور جانی قربانیاں بھی ہیچ ہیں بمقابلہ اس اعزاز اور فضل کبیر کے۔

اس کے بعد اللہ ان کو یقین دہانی کراتا ہے کہ یہودیوں کا دور اس کرہ ارض پر سے ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ حاملین امانت الٰہیہ نہیں رہے۔ نہ ان کے دلوں میں یہ بات ہے اور نہ ان کے کردار میں یہ بات ہے کیونکہ اس امانت کو اٹھانے والے دل فقیہ، صاحب ادراک، مخلص اور باعمل دل ہوتے ہیں۔

تفسیر تدبر القرآن

(ذلك فضل الله يؤتيه من يشا والله ذوالفضل العظيم)(4)۔

(یہود کے حسد پر تعریض)۔ یہ اسی فضل عظیم کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالٰی نے امیوں پر فرمایا اور جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ارشاد ہوا کہ یہ اللہ تعالٰی کا فضل ہے۔ اس پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے اس کے لیے انتخاب فرماتا ہے اور اس کا ہر چاہنا اس کی اپنی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہود کو اس پر حسد ہے تو وہ جتنا حسد کرنا چاہیں کرلیں۔ اس سے وہ اپنا ہی نقصان کریں گے کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑیں گے خدا نے امیوں کو اپنی چیز دی، کسی دوسرے کی نہیں دی ہے کہ وہ اس پر غصہ کا اظہار کرے۔

Ayat No 5

مَثَلُ الَّذِيۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰٮةَ ثُمَّ لَمۡ يَحۡمِلُوۡهَا كَمَثَلِ الۡحِمَارِ يَحۡمِلُ
اَسۡفَارًا ؕ بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا
يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ‏ ۝5

Masalul lazeena hum milut tawraata summa lam yahmiloohaa kamasalil himaari yah milu asfaaraa; bi'sa masalul qawmil lazeena kaazzaboo bi aayaatil laah; wallaahu laa yahdil qawmazzaalimeen

(62 *AlJuma Verse* 05 الجمعة ایت 05)

ترجمہ تفہیم القرآن

جن لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا، اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں، اس سے بھی زیادہ بُری مثال ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔ (5)

The parable of those who were charged with the Torah and then they failed to live up to it is that of a donkey laden with books. Even more evil is the parable of the people who gave the lie to the Signs of Allah .Allah does not direct such wrong-doers to the Right Way.

تفسیر تفہیم القرآن

سورۃ الۡجُمُعَة 7

اس فقرے کے دو معنی ہیں۔ ایک عام اور دوسرا خاص۔ عام معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر توراۃ کے علم و عمل، اور اس کے مطابق دنیا کی ہدایت کا بار رکھا گیا تھا، مگر نہ انہوں نے اپنی اس ذمہ داری کو سمجھا اور نہ اس کا حق ادا کیا۔ خاص معنی یہ ہیں کہ حامل توراۃ

گروہ ہونے کی حیثیت سے جن کا کام یہ تھا کہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس رسول کا ساتھ دیتے جس کے آنے کی صاف صاف بشارت توراۃ میں دی گئی تھی، مگر انہوں نے سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی اور توراۃ کی تعلیم کے تقاضے کو پورا نہ کیا۔

سورۃ الْجُمُعَة 8

یعنی جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوں اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اسی طرح یہ توراۃ کو اپنے اوپر لادے ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ کتاب کس لیے آئی ہے اور ان سے کیا چاہتی ہے۔

سورۃ الْجُمُعَة 9

یعنی ان کا حال گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا اس لیے مغرور ہے۔ مگر یہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ توراۃ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اس کے معنی سے ناواقف نہیں ہیں۔ پھر بھی یہ اس کی ہدایات سے دانستہ انحراف کر رہے ہیں، اور اس نبی کو ماننے سے قصداً انکار کر رہے ہیں جو توراۃ کی رو سے سراسر حق پر ہے۔ یہ نافہمی کے قصوروار نہیں ہیں بلکہ جان بوجھ کر اللہ کی آیات کو جھٹلانے کے مجرم ہیں۔

تفسیر فی ظلال القرآن

مثل الذین .... القوم الظلمین (5:26) ''جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا''۔

بنی اسرائیل کو توریت دی گئی اور وہ نظریہ اور شریعت کی امانت کے حامل بنے۔ لیکن انہوں نے۔

لم یحملوھا (5:26) ''انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا''۔ کیونکہ اس امانت کو ادراک تفقہ اور فہم و فراست اور حکمت و دانائی کے ساتھ اٹھایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ضمیر کی دنیا میں اور عمل کی دنیا میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا چھوڑ دیا تھا اور قرآن نے جس

طرح بنی اسرائیل کی سیرت کا ریکارڈ پیش کیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس امانت کی کوئی قدر نہ کی۔ وہ صرف ایک بوجھ اٹھا رہے تھے۔اسامانت اور دین کے مقاصد پورے نہ کر رہے تھے۔

یہ نہایت ہی حقیر تصویر ہے، ان کو جو یہاں قرآن کریم نے کھینچی ہے، لیکن یہ تصویر ان کی حقیقت کا اظہار نہایت ہی عمدہ طریقے سے کرتی ہے۔

بئس مثل .... الظلمین (5:26)''اس سے بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہی دیتا''۔

اور جن لوگوں کو یہ آخری امانت دی گئی ہے، وہ اگر یہی رویہ اختیار کرتے ہیں تو ان کی مثال بھی ایسی ہی ہے وہ سب لوگ جن کو دینی امانت دی گئی اور وہ اس کا حق ادا نہیں کرتے۔ان کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ مسلمان جن پر صدیاں گزر گئیں اور وہ مسلمانوں کے صرف نام اٹھائے ہوئے ہیں، ان کے اندر مسلمانوں کے اعمال نہیں ہیں، خصوصاً وہ لوگ جو قرآن اور کتب اسلامی کو پڑھتے ہیں اور وہ فرائض ادا نہیں کرتے جو ان میں ہیں۔ یہ سب لوگ ایسے ہی ہیں جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ ہمارے دور میں ایسے لوگ بہت ہیں۔ مسئلہ کتابوں اور تدریس و تعلیم کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ عمل اور ذمہ داریاں اٹھانے کا ہے۔

یہودیوں کا زعم یہ تھا اور اب بھی ان کے اندر یہ زعم موجود ہے کہ وہ اللہ کی مختار قوم ہیں، پسندیدہ اور برگزیدہ! اور یہ کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں بمقابلہ تمام دوسری اقوام کے۔ جبکہ دوسری اقوام گویم ہیں یا امی ہیں یا ممی ہیں۔ لہٰذا ان پر اپنے دن کے احکام پر عمل کرنا لازمی نہیں ہے۔ یہ گویم کے لئے ہے۔

وقالوا لیس .... سبیل اگر ہم دوسری اقوام کے لوگوں پر کوئی زیادتی کریں تو ہم پر مواخذے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے دعوے وہ کرتے تھے۔ جن پر کوئی دلیل نہ تھی۔ یہاں اللہ ان کو دعوت مباہلہ دیتا ہے۔ دعوت مباہلہ ان کو بھی دی گئی اور نصاریٰ کو بھی۔

(مثل الذین حملوا الشورۃ ثم لم یحملوھا کمثل لحمار یحمل اسفارا بئس مثل القوم الذین کذبوا بایت اللہ واللہ لا یھدی القوم الظلمین)(5)۔

(یہود کے پندار پر ضرب)۔ یہ یہود کے پندار کے ضرب لگائی ہے کہ اگر وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ کتاب و شریعت کے حامل وہی ہو سکتے ہیں، کوئی دوسرا اس شرف میں ان کا حریف نہیں ہو سکتا، تو یہ گھمنڈ اب وہ اپنے دماغ سے نکال دیں۔ اب ان کی مثال اس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ تو اٹھائے ہوئے ہے لیکن اسے کچھ خبر نہیں کہ ان کتابوں میں کیا ہے۔ (حملوا التورۃ ثم لم یحملوھا) یعنی اس میں تو شبہ نہیں کہ ایک زمانے میں ان کے اوپر تورات کا بوجھ لادا گیا لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ انہوں نے اس بار گراں کو اٹھایا نہیں۔ اس نہ اٹھانے کی وضاحت (کذبوا بایت اللہ) کے الفاظ سے فرما دی گئی کہ تورات کی تعلیمات اور اس کے احکام پر ان کا ایمان باقی نہیں رہا، عملاً انہوں نے ان کی تکذیب کر دی۔ ظاہر ہے کہ جب ان کتابوں کے احکام کی انہوں نے تکذیب کر دی تو ان کے اجر سے تو وہ محروم ہو گئے، صرف ان کا دزر اور گناہ ان کے سر باقی رہا اور وہ اس مثل کے مصداق ہیں کہ چار پائے برو کتابے چند۔

(حملوالتورۃ) میں لفظ حملو نہایت بلیغ ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس تورات کے حامل ہونے پر آج ان کو ناز ہے وہ انہوں نے اس وقت بھی شوق و رغبت سے نہیں قبول کی تھی جس وقت انہیں عطا ہوئی تھی بلکہ وہ گویا ان پر زبردستی لادی گئی تھی۔ اس زبردستی لادنے کی پوری تفصیل سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے کہ تورات کے ایک ایک حکم کو قبول کرنے میں یہود نے کس کس طرح اپنی ضد و مکابرت کا مظاہرہ کیا ہے اور حضرت موسیٰؑ نے کس سوز و غم کے ساتھ ان کی اس حالت پر ماتم کیا ہے۔ اس کی طرف سرسری اشارہ سورۃ صف کی آیت 5 میں بھی ہے۔ (بئس مثل القوم الذین کذبوا بایت اللہ) فرمایا کہ جن کی مثال اتنی مکروہ ہے ان کے لیے زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے تقدس و تقرب الٰہی کے زعم میں مبتلا ہوں اور یہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کے ہوتے خدا کسی دوسرے کو کتاب و شریعت کا حامل نہیں بنا سکتا۔

(جو کتاب پر عامل نہیں وہ اس کا حامل بھی نہیں)۔ کذبوا بایت اللہ کے الفاظ سے اوپر کے الفاظ (ثم لم یحملوھا) کی وضاحت ہو گئی کہ تورات کے نہ اٹھانے کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اس کے احکام کی اپنی عمل سے تکذیب کر دی۔ زبان سے تو دعویٰ ہے کہ وہ اس کے حامل ہیں لیکن جب اس پر عامل نہیں تو اس کے حامل کیسے ہوئے؟

(واللہ لا یھدی القوم الظلمین) یہ ٹکڑا بعینہٖ سورۃ صف کی آیت 7 میں بھی گزر چکا ہے۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف کہ ان کی بداعمالیوں کے سبب سے ان پر لعنت ہو چکی ہے اور اللہ نے ان کے دلوں پر جیسا کہ سورۃ بقرہ میں تفصیل گزر چکی ہے۔ مہر کر دی ہے، اس وجہ سے اب ان کو ہدایت نصیب ہونے والی نہیں ہے۔ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا ان کو تورات دی گئی تو اس کی انہوں نے تکذیب کر دی اور اب اسی تورات کے حامل ہونے کے زعم میں اللہ کے آخری رسول کی تکذیب کر رہے ہیں کہ بھلا ان کے ہوتے کسی اور قوم کے اندر کوئی رسول کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ ایسے بدبختوں کو خدا ہدایت نہیں دیا کرتا۔ اس طرح کے لوگ ہمیشہ اسی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

Ayat No 6

قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ هَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّكُمۡ اَوۡلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ
فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝٦

Qul yaaa ayyuhal lazeena haadoo in za'amtum annakum awliyaaa'u lillaahi min doonin naasi fatamannawul mawta in kuntum saadiqeen

(62 *AlJuma Verse* 06 الجمعة ایت 06)

ترجمہ تفہیم القرآن

اِن سے کہو، "اے لوگو جو یُہودی بن گئے ہو، اگر تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر بس تم ہی اللہ کے چہیتے ہو تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو۔" (6)

Tell them" :O you who have become Judaised, if you arrogantly fancy that you are Allah's favourites to the exclusion of all people, then wish for death, if you are truthful in your claim".

یہ نکتہ قابل توجہ ہے۔ "اَے یہودیو" نہیں کہا ہے بلکہ "اَے وہ لوگو جو یہودی بن گئے ہو" یا" جنہوں نے یہودیت اختیار کرلی ہے "فرمایاہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل دین جو موسیٰؑ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء لائے تھے وہ تو اسلام ہی تھا۔ان انبیاء میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا،اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد جب سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی تو یہ خاندان اس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی، اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کرلی جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر اسیریا نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کردیا بلکہ ان اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام ونشان مٹادیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔اس کے بعد صرف یہوداہ،اوراس کے ساتھ بن یامین کی نسل باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے "یہود" ہی کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔اس نسل کے اندر کاہنوں اور ربیوں اور احبار نے اپنے اپنے خیالات و نظریات اور رجحانات کے مطابق عقائد اور رسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچہ صدہا برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے۔ یہ ڈھانچا چوتھی صدی قبل مسیح سے بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی عیسوی تک بنتا رہا۔اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عنصر اس میں شامل ہے۔اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔اسی بنا پر قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ان کو الذِیۡنَ ھَادُوۡا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے،یعنی "اے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو"۔ان میں سب کے سب اسرائیل ہی نہ تھے، بلکہ وہ غیر اسرائیلی بھی تھے جنہوں نے یہودیت قبول

کرلی تھی۔ قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے وہاں "اے بنی اسرائیل" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور جہاں مذہب یہود کے پیروؤں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

سورۃ الْجُمُعَة 11

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان کے اس دعوے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ یہودیوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا (البقرہ۔111) ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہ چھوئے گی، اگر ہم کو سزا ملے گی بھی تو بس چند روز (البقرہ۔80، آل عمران۔24)۔ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں (المائدہ۔18) ایسے ہی کچھ دعوے خود یہودیوں کی اپنی کتابوں میں بھی ملتے ہیں۔ کم از کم یہ بات تو ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ مخلوق (Chosen People) کہتے ہیں اور اس زعم میں مبتلا ہیں کہ خدا کا ان کے ساتھ ایک خاص رشتہ ہے جو کسی دوسرے انسانی گروہ سے نہیں ہے۔

سورۃ الْجُمُعَة 12

یہ بات قرآن مجید میں دوسری مرتبہ یہودیوں کو خطاب کرکے کہی گئی ہے۔ پہلے سورۃ بقرہ میں فرمایا گیا تھا "ان سے کہو، اگر آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے اللہ کے ہاں مخصوص ہے تو پھر تم موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ بلکہ تم تمام انسانوں سے بڑھ کر، حتیٰ کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر ان کو کسی نہ کسی طرح جینے کا حریص پاؤ گے۔ ان میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس جیے، حالانکہ وہ لمبی عمر پائے تب بھی اسے یہ چیز عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ ان کے سارے کرتوت اللہ کی نظر میں ہیں" (آیات 94۔96) اب اسی بات کو پھر یہاں دہرایا گیا ہے۔ لیکن یہ محض تکرار نہیں ہے۔ سورۃ بقرہ والی

آیات میں یہ بات اس وقت کہی گئی تھی جب یہودیوں سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہ ہوئی تھی۔اوراس سورۃ میں اس کااعادہ اس وقت کیاگیاہے جب ان کے ساتھ متعدد معرکے پیش آنے کے بعد عرب میں آخری اور قطعی طور پران کازور توڑدیاگیا۔ان معرکوں نے اوران کے اس انجام نے وہ بات تجربے اور مشاہدے سے ثابت کردی جو پہلے سورۃبقرہ میں کہی گئی تھی۔مدینے اور خیبر میں یہودی طاقت بلحاظ تعداد مسلمانوں سے کسی طرح کم نہ تھی،اور بلحاظ وسائل ان سے بہت زیادہ تھی۔پھر عرب کے مشرکین اور مدینے کے منافقین بھی ان کی پشت پر تھے اور مسلمانوں کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔لیکن جس چیز نے اس نامساوی مقابلے میں مسلمانوں کو غالب اوریہودیوں کو مغلوب کیاوہ یہ تھی کہ مسلمان راہ خدامیں مرنے سے خائف تو در کنار،تہ دل سے اس کے مشتاق تھے اور سر ہتھیلی پر لیے ہوئے میدان جنگ میں اترتے تھے۔کیونکہ انہیں اس بات کا یقین تھاکہ وہ خداکی راہ میں لڑرہے ہیں،اور وہ اس بات پر بھی کامل یقین رکھتے تھے کہ اس راہ میں شہید ہونے والے کے لیے جنت ہے۔اس کے برعکس یہودیوں کاحال یہ تھاکہ وہ کسی راہ میں بھی جان دینے کے لیے تیار نہ تھے،نہ خداکی راہ میں،نہ قوم کی راہ میں،نہ خود اپنی جان اور مال اور عزت کی راہ میں۔انہیں صرف زندگی درکار تھی،خواہ وہ کیسی ہی زندگی ہو۔اسی چیز نے ان کو بزدل بنادیاتھا۔

تفسیر فی ظلال القرآن

قل یایھا الذین...................کنتم تعملون(8)(26:6تا8)''ان سے کہو،''اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو،اگر تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر بس تم ہی اللہ کے چہیتے ہو تو موت کی تمنا کرو۔اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو''۔لیکن یہ ہر گز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں،اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتاہے۔ان سے کہو''جس موت سے تم بھاگتے ہو،وہ تو تمہیں آکر رہے گی۔پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے،اور وہ تمہیں بتادے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو''۔

مباہلہ کے معنی یہ ہیں کہ فریقین آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں اور دونوں مل کر دعا کریں کہ اے اللہ ہم دونوں میں سے جو برسر باطل ہے، اسے ہلاک کر دے۔ رسول اللہ ﷺ نے جن جن لوگوں کو مباہلہ کے لئے دعوت دی وہ ڈر کر سامنے نہیں آئے۔ کسی نے بھی حضور اکرم کی دعوت مباہلہ قبول نہیں کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دل ہی دل میں اسلام کی حقانیت کے قائل تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ سچے ہیں اور یہ دین حقیقی دین ہے۔

امام احمد نے روایت کی ہے اسماعیل ابن یزید زرقی سے، انہوں نے ابو یزید سے، انہوں نے فرات سے، انہوں نے عبدالکریم ابن مالک جزری سے، انہوں نے عکرمہ سے، انہوں نے ابن عباسؓ سے کہ ابو جہل ملعون نے یہ کہا کہ اگر میں نے محمد کو خانہ کعبہ میں دیکھا تو میں اس پر حملہ کر دوں گا یہاں تک کہ میں اس کی گردن دبادوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر اس نے ایسا کیا ہوتا تو فرشتے اسے اعلانیہ پکڑ لیتے اور اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو وہ مر جاتے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ جہنم میں ان کے مقامات کیا ہیں اور جن لوگوں کو رسول اللہ ﷺ نے دعوت مباہلہ دی تھی اگر وہ نکلتے تو جب واپس آتے تو نہ ان کا مال ہوتا اور نہ ان کے اہل وعیال موجود ہوتے۔ (بخاری، ترمذی)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت ان کے لئے مباہلے کا چیلنج نہ ہو، محض چیلنج ہو۔ کیونکہ ان کا زعم تھا کہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اللہ کے محبوب اور دوست ہیں تو کیوں نہیں جلدی کرتے کہ اللہ کے ہاں انعامات پائیں۔ دوست تو دوست کی ملاقات کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان کے اس دعوے پر تبصرہ کیا گیا کہ یہ جھوٹے ہیں اور جو دعویٰ کر رہے ہیں ان میں وہ سچے نہیں ہیں۔ ان کو یہ یقین نہیں ہے کہ انہوں نے دنیا میں آخرت کے لئے کوئی اچھا عمل کیا ہے، جس پر ان کو اجر وثواب ملنے والا ہے۔ انہوں نے تو برے کام ہی آگے بھیجے ہیں، جن کی وجہ سے وہ موت سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور جس شخص کے پاس زادراہ نہ ہو، وہ سفر پر نہیں نکلتا۔

(قل یایھا الذین ھادو ان زعمتم انکم اولیاء اللہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صدقین)(6)۔

(یہود کے پندار پر ایک اور ضرب)۔ یہ ان کے اسی پندار پر ایک اور ضرب لگائی کہ اگر تمہارا زعم یہ ہے کہ تم خدا کے محبوب ہو تو اس محبت و محبوبیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمہارے اندر خدا کی راہ میں جان دینے کا شوق وولولہ ہو۔ محب کو سب سے زیادہ آرزو و محبوب کی ملاقات کی ہوتی ہے۔ وہ اس چیز سے جان نہیں چراتا جو محبوب سے ملاقات کی راہ کھولے، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ موت کا مقابلہ کرنے میں تم سے زیادہ بزدل کوئی نہیں۔ سورۃ صفت کی آیت 4،5 میں ان کے حال پر جو تبصرہ فرمایا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ سورۃ حشر میں بنو قریظہ اوران کے حلیفوں کی بزدلی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

(لَاَ اَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۔ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍط بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌط تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰيط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّايَعْقِلُوْنَ۔)(الحشر۔59۔ 13،14)(ان کے سینوں میں تمہارا ڈر اللہ کے خوف سے زیادہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں۔ یہ کبھی تم سے کھلے میدان میں لڑنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ لڑیں گے تو قلعہ بند بستوں میں یا دیواروں کی اوٹ سے۔ ان کے اپنے اندر شدید مخاصمت ہے۔ تم ان کو متحد گمان کر رہے ہو، حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقل سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔)

سورۃ بقرہ میں یہی مضمون نسبۃً تفصیل سے اس طرح بیان ہوا ہے۔

(قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَكُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ عِنۡدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۔ وَلَنۡ يَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ‌ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيۡمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ۔ وَلَتَجِدَنَّهُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ‌ۚ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا‌ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمۡ لَوۡ يُعَمَّرُ اَلۡفَ سَنَةٍ‌ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ يُّعَمَّرَ‌ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيۡرٌ ۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ۔)(البقرۃ:۔ 20۔ 95،96)(کہہ دو اگر دار آخرت کی تمام نعمتیں اللہ کے پاس دوسروں کے مقابل میں تمہارا ہی حق ہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔اور یہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اپنی ان کرتوتوں کے سبب سے جو انہوں نے کی ہیں اور اللہ ان ظالموں سے اچھی طرح باخبر ہے اور تم ان کی زندگی کا سب سے زیادہ حریص پائوگے۔ یہاں تک کہ یہ مشرکوں سے بھی زیادہ زندگی کے حریص ہیں۔ان میں سے ہر ایک کی تمنا ہے کہ ہزار سال جیے۔)

(من دون الناس سے بنی اسماعیل کی طرف اشارہ ہے۔) آیت زیر بحث ہیں (من دون الناس) کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن یہاں اشارہ خاص طور پر بنی اسماعیل ہی کی طرف ہے۔ تورات کی پیشین گوئیوں اور نسلی رقابت کی بناء پر یہود کو سب سے زیادہ پرخاش انہی سے تھی۔ اس پرخاش کی پوری سرگزشت سورۃ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہ پرخاش تھی تو شروع ہی سے لیکن آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد جب انہوں نے تاڑ لیا کہ وہ خطرہ سر پر آگیا جس سے وہ اندیشہ ناک تھے تو یہ آگ پوری طرح بھڑک اٹھی۔

(یہود کی بزدلی پر ان کی پوری تاریخ گواہ ہے) قرآن نے یہاں یہود کی جس بزدلی پر طنز کیا ہے اگرچہ وہ اس کے جواب میں بے حیائی سے کہہ سکتے تھے کہ ہم موت سے ڈرنے والے لوگ نہیں ہیں لیکن آدمی سے اپنا باطن مخفی نہیں ہوتا۔انہیں محسوس ہوا کہ قرآن نے ان کی نہایت دکھتی رگ پکڑی ہے چناچہ انہوں نے خاموشی ہی میں سلامتی دیکھی وہ ایک ایسی بات کی تردید کس طرح کر سکتے تھے جس کی شہادت ان کی ماضی کی تاریخ بھی دے رہی تھی اور حاضر کے واقعات بھی جس کے گراہ تھے۔

Ayat No 7

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

Wa laa yatamannaw nahooo abadam bimaa qaddamat aydeehim; wallaahu 'aleemum biz zaalimeen

(62 *AlJuma Verse* 07 الجمعة ایت 07)

ترجمہ تفہیم القرآن

لیکن یہ ہر گزاس کی تمنانہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں،اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔(7)

But they shall never wish for death because of the (evil) deeds they have committed. Allah is well aware of these evil-doers.

تفسیر تفہیم القرآن

سورۃ الْجُمُعَة13

بالفاظ دیگران کا موت سے یہ فرار بے سبب نہیں ہے۔وہ زبان سے خواہ کیسے ہی لمبے چوڑے دعوے کریں، مگران کے ضمیر خوب جانتے ہیں کہ خدااوراس کے دین کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہے،اور آخرت میں ان حرکتوں کے کیا نتائج نکلنے کی توقع کی جاسکتی ہے جو وہ دنیا میں کر رہے ہیں۔اسی لیے ان کا نفس خدا کی عدالت کا سامنا کرنے سے جی چراتا ہے۔

تفسیر فی ظلال القرآن

ولا یتمنونه................بالظلمین(7:26)"لیکن یہ ہر گزاس کی تمنانہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں،اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے"۔

اب آخری دور میں موت کی حقیقت ان کو بتادی جاتی ہے۔ یہ جو موت سے ڈرتے ہیں اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ موت تو ایک قطعی امر ہے اوراس سے کوئی ڈر نہیں ہے۔ کوئی مضر نہیں ہے، موت کے بعد تواللہ کی طرف جاناہے،اور پھر اللہ کے ہاں حساب وکتاب دیناہے، جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

تفسیر تدبر القرآن

(ولا یتمنونه ابدا بما قدمت ایدیهم واللہ علیم بالظلمین)(7)۔

یہ ان کی بزدل کے سبب کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس چیز نے ان کو موت سے اتنا خائف کرر کھا ہے یہ ان کے اعمال ہیں۔ یہ نبیوں کے قاتل ہیں، یہ تورات کے محروف ہیں، اللہ کی امانتوں میں خیانت کرنے والے ہیں اور انہوں نے ان تمام نشانات ہدایت کو مٹایاہے جن کو خلق کے سامنے اجاگر کرنے پر یہ مامور ہوئے تھے تواب یہ کیامنہ لے کے اپنے رب کے سامنے جائیں گے ! لیکن ان کو بہر حال اس کے حضور میں حاضر ہوناہے اور وہ ان ظالموں سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ہر ایک کواس کے کیے کی بھرپور سزادے گا۔

Ayat No 8

قُلۡ اِنَّ الۡمَوۡتَ الَّذِىۡ تَفِرُّوۡنَ مِنۡهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيۡكُمۡ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝٨

Qul innal mawtal lazee tafirroona minhu fa innahoo mulaaqeekum summa turaddoona ilaa 'Aalimil Ghaibi wash shahaadati fa yunabbi'ukum bimaa kuntum ta'maloon

(62 *AlJuma Verse* 08 الجمعة ایت 08)

ترجمہ تفہیم القرآن

ان سے کہو، ”جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تمہیں آکر رہے گی۔ پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ وظاہر کا جاننے والاہے، اور وہ تمہیں بتادے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ “(8)

Tell them" :The death from which you flee will certainly overtake you. Then you will be returned to Him Who fully knows what is hidden and what is manifest. Thereupon He will let you know all that you used to do".

تفسیر تفہیم القرآن

تفسیر فی ظلال القرآن

قل ان..................تعملون(8:26)"ان سے کہو، "جس موت سے تم بھاگتے ہو، وہ تو تمہیں آکر رہے گی۔ پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ وظاہر کا جاننے والا ہے، اور وہ تمہیں بتادے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

یہ ایک توجہ دلاؤ نوٹس ہے، مسلمانوں کو، اور غیر مسلموں سب کو کہ ایک حقیقت کو اپنے دل ودماغ میں تازہ کرلو۔ اور لوگ اس اٹل حقیقت کو بھول جاتے ہیں، یا بھلانے کی کوشش کرتے ہیں، موت تو آنے والی ہے۔ یہ زندگی ختم ہونے والی ہے۔ اس دنیا میں تم جس قدر اس سے بھاگو، تم موت کے منہ میں پہنچ جاؤ گے۔ لہٰذا کوئی جائے پناہ اللہ کے سوا نہیں ہے، وہاں حساب و کتاب دینے سے کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

طبری نے اپنے معجم میں معاذ ابن محمد ھذلی کی حدیث روایت کی ہے۔ یونس سے، انہوں نے حسن سے، انہوں نے حضرت سمرۃ سے، مرفوع صورت میں کہ "جو شخص موت سے بھاگتا ہے، اس کی مثال لومڑی جیسی ہے جس سے زمین اپنا قرضہ مانگ رہی تھی، تو وہ بھاگنے لگی یہاں تک کہ بھاگتے بھاگتے تھک گئی اور اس کے لئے بھاگنا ممکن نہ رہا تو وہ اپنے سوراخ میں جا گھسی تو وہاں زمین نے اس سے کہا: "اے لومڑی میرا قرضہ ؟""

اب اس سورت کا آخری مقطع آتا ہے اویہ جمعہ کی نماز کے بارے میں ہے، یہ اس موقعہ کی نسبت سے جو واقعہ ہوا شاید ایسا واقعہ ایک سے زائد مرتبہ ہوتا ہوگا کیونکہ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہوتا رہتا تھا۔

(قل ان الموت الذی تفرون منه فانه ملقیکم ثم تردون الی علم الغیب والشهادة فینبئکم بما کنتم تعملون)(8)۔

اوپر (واللہ علیم بالظلمین) میں جو تہدید مضمر تھی وہ اس آیت میں اچھی طرح کھل گئی ہے۔ فرمایا کہ موت سے بھاگتے ہو تو بھاگو، لیکن تم اس سے بھاگ کے کہاں جائو گے ؟ وہ تمہیں پکڑ ہی لے گی۔ پھر تم اپنی تمام بد اعمالیوں کے ساتھ اپنے اس خدا کے سامنے پیش کیے جائو گے جو تمام غائب و حاضر کا جاننے والا ہے۔ نہ اس سے تمہارا کوئی فعل مخفی ہے، نہ کوئی چیز تم اس سے چھپا سکو گے۔ وہ تمہارا سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے رکھ دے گا اور تمہیں اپنے ہر جرم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔